ابنِ انشا کے سفرنامے میں افسانویت

روبینہ اللہ دتہ
محمد خاں اشرف

Abstract:

Ibn-e-Inshais the name of an unitarianizing personality. He is a renowned name of urdu literature. His real name is Sher Muhammad Khan and pen name is Insha. He was born on June 15, 1947 in avillage near by Jalandhar. He served in both poetry and prose. He is a significant name in urdu satire and humour who has no match due to his bold and satiric accent and beautiful writing style. After reaching the height of fame for his heart touching poetry and satire when he portrayed hiscreative skills intravelogue writing this calss of literature also raised in decorum. History or urdu travelogue can't be completed without his travelogues. His travelogues"DuniyaGolhai", "Chaltay Ho To Cheen Ko Chaliye","Ibn-e-Batoota Ke Ta'aqub Mein" and "Awaragard Ki Diary" are a very significant asset in the history of travelogue writing. The satiric touch in his travelogues award such a freshness and excitement to his style that makes him an unparallel name in the field. Although hs is not among us today but his creations in poetry and prose are enough toaward him eternity.

جدید دور کے سفرنامہ نگاروں میں ابنِ انشا کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کا اندازِ تحریر مخصوص اور ہلکا پھلکا ہے لیکن شاعری اور نثر نگاری دونوں میں ان کی شخصیت بالکل مختلف رنگ میں نظرا؟تی ہے۔

اسلوب وہ طریقہ، فن، ڈھنگ اور عمل ہے جس پر چل کر کوئی فن کار یا ادیب اپنے لیے راہ نکالتا ہے۔ پھر یہی عمل اُس کی زندگی کا لازم جزو بن کر اس کی شخصیت کی پہچان اور اس کی دوامیت کا نقارہ ثابت ہوتا ہے۔ابنِ انشا بہ یک وقت صحافی، شاعر، افسانہ نگار، مزاح نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ان کے قلم سے نکلے ہوئے موتی اس آب وتاب سے جھلک دکھلا رہے ہیں کہ ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ان کے قلم کی جولانیاں اور شوخیاں کبھی فطری

رنگینیوں میں مدغم ہو جاتی ہیں تو کبھی تخیل کی فراوانی سے حوروں کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے، جو جنگلوں، بیابانوں سے افراط افراد سے مڈھ بھیڑ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے مناظر کو زیب و زینت نہیں بخشتے بلکہ قاری کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں کہ آؤ تمھیں ایک کہانی سناؤں۔ یہ کہانی ان کی اپنی دیکھی ہوئی اور اُس راہ تک خود چل کر واپس آئی ہے جہاں ایک طرف حسین و جمیل محفل برپا ہے تو دوسری طرف رقص و سرود کی رونقیں برپا ہیں۔

فکشن یا افسانوی ادب میں عام طور پر چار اصناف نثر، داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما کو شمار کیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اور یہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حقیقی عکاس ہوتا ہے۔اردو ادب میں افسانویت یا افسانوی ادب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو فکشن کے سرمائے میں بنیادی حیثیت مختصر افسانے اور ناول کو حاصل رہی ہے اور اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس لحاظ سے اردو فکشن نے اب تک ڈیڑھ دو صدی کا لمبا سفر طے کیا ہے۔ایڈوانس لرنرز ڈکشنری میں فکشن کی تعریف کچھ اس طرح ہے:

> ‘‘The type of book or story that is written about imaginary characters and events and not based on real people and facts.’’1

بلراج کومل فکشن کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> ’’فکشن کی ذیل میں وہ بیانیہ نثری تحریریں رکھی گئی ہیں جن میں تخیل اور تخلیقی سطح پر واضح مناظر اور کرداروں کی مدد سے نمائندگی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔‘‘۲

WebsterMerriam پر فکشن کی تعریف کچھ یوں ہے:

> ‘‘Something invented by the imagination or feigned-specifically on invented story.’’3

افسانوی ادب کے عناصر کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کئی موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے ملتے ہیں۔ان عناصر میں پلاٹ، مکالمہ، کہانی، کردار، جزئیات نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری اور دیگر بہت سے افسانوی عناصر کے زمرے میں آتے ہیں۔ظہیر احمد صدیقی ان افسانوی عناصر اور سفرنامے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’اچھا سفرنامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی داستان طرازی، ناول کی سی فسانہ سازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی، کچھ آپ بیتی کا سا مزہ، کچھ جگ بیتی کا سا لطف اور پھر سفر کرنے والا جزو تماشہ ہو کر اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی بات پر لطف ہو اور معلومات افزا بھی۔‘‘۴

ظہیر احمد صدیقی کی درج بالا بات سفرنامے میں افسانویت اور افسانوی عناصر کے زیادہ قریب ہے کیونکہ

کوئی بھی صنفِ ادب ہو اس میں مشاہدے اور تجربے کو وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو جسم میں روح کو ہے۔ افسانے یا ناول میں حقیقت کو افسانے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے جبکہ سفرنامے میں حقیقت ہی افسانے کے روپ میں دکھائی جاتی ہے۔ کبھی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے تو کبھی سماجی ومعاشرتی وسیاسی حالات کی دل کش انداز میں تصویر کشی کرتے ہوئے اور سفرنامہ نگار خود بھی کہانی کا کردار بنتے ہوئے سفرنامے کا حصہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک سفرنامے میں افسانوی عناصر سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہمارے بعض سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفری تاثرات کو باقاعدہ افسانوی انداز میں پیش کرنے کی بھی سعی کی ہے اور سفر روداد کو کہانی پن سیہم ا؟ ہنگ کرنے کی خاطر تخیل اور فلیش بیک کا سہارا لیا ہے۔''۵

اگر ان عناصر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ابنِ انشا کے سفرناموں کا مطالعہ کیا جائے تو کئی عناصر ان کے سفرناموں میں موجود ہیں۔ سفرنامہ اگرچہ حقیقی واقعات ومشاہدات کی سفری روداد ہوتی ہے لیکن حقیقت کے ساتھ ساتھ اس میں تخیلاتی واقعات کا بھی سہارا لیا جاتا ہے تاکہ سفرنامے کی دل چسپی قائم رہے اور قاری اس کے سحر میں جکڑا رہے۔

انشا جی کے سفرنامے پڑھ کر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسفار انھوں نے نہیں کیے بلکہ اپنی زندگی پر منطبق کر کے اسی ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ بہت سے مناظر میں قدرتی رنگ جمانے کا ایک خاص ملکہ انھیں حاصل ہے اور جہاں جاتے ہیں وہاں کی تکالیف کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ یہ تکلیف خود ایک کھٹا میٹھا چٹکلہ معلوم ہوتی ہے اور قاری دیر تک اس منظر سے باہر نہیں آتا۔ ان کا اندازِ بیاں ملاحظہ کیجیے:

چل اے ہوائے زمستاں چل اور زور سے چل
تو سرد مہری احباب سے زیادہ نہیں۶

سراپا نگاری بہت بڑا وصف ہے کسی بھی تحریر کا کہ مصنف جس چیز کا ذکر کر رہا ہے وہ چیز اپنی تمام تر جولانیوں اور جملہ خوبیوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش ہو جائے۔ سراپا حقیقت تو نہیں ہوتا مگر حقیقت کے بین تخیل کی پُر پیچ راہوں میں ایک چلتی پھرتی تصویر ضرور ذہن میں حاوی رہتی ہے۔ یہی وصف ایک ادیب کو عام سے خاص کی طرف لے کر جاتا ہے۔ ابن انشا کے سفرناموں میں کمال کی سراپا نگاری ملتی ہے۔ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

''یہ بادام سی آنکھیں اور یہ سیب سے گلابی گال، نقش موٹے موٹے تھے لیکن دلآویز اور صحت مند اور مسکراہٹ اور شیریں آواز تو ان نقوش میں عجب رنگ بھر دیتی تھی...... بات بے بات اسی ملائمت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ بس......''۷

میرے خیال میں بھی اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں بھی ہے کہ ادیب کے لیے صاحبِ کمال کا

مطالعہ ازحد لازم ہے یعنی جب کوئی ادیب یا انشا پرداز اپنے شعرا اور ادبا کا بغور مطالعہ نہ کرے ان کے کلام کو صحیح طور پر پرکھ نہ لے تب تک وہ درستی سے لکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ انشا جی کے کلام پر نظر ڈالنے سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہم عصر اور قدیم شعرا وادبا کا وسیع القلبی سے مطالعہ کر رکھا ہے۔ جہاں کہیں مناسب مقام ملتا ہے اپنے کلام کو محترم اساتذہ فن کے کلام سے نوازتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے اشعار اور امثال اس موقع کی مناسبت سے اتنی جاندار ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یا لائنیں صرف بنی ہی اسی لیے تھیں۔ خاص طور پر کلام غالب اور کلامِ اقبال سے اپنے سفرناموں کو مزین کرتے جاتے ہیں:

قرض کا پیتے ہیں پانی ، پر سمجھتے ہیں کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن[۸]

......

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو[۹]

......

گر ہو شراب و ساغر و محبوب خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے[۱۰]

ابنِ انشا کے سفرنامے اپنی رنگین طرزِ تحریر کی شگفتگی کے باعث قارئین میں بہت مقبول ہیں۔ ان کے احساسات نے سفرنامے میں جا بجا شعور کی کرنیں بکھیری ہیں۔ احساسات اور خیالات کی لہریں جوان کے ذہن کے سمندر میں موجزن تھیں ان کو انشا نے نہایت مہارت سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

تقابل انشا جی کا خاصا ہے۔ اپنی تہذیب کی شان وشوکت اور اس کے لیے دل میں کسک درجۂ اتم تک پہنچ چکی ہے۔ جگہ جگہ اپنی تہذیب وثقافت کے گن گاتے ہیں اور بہت سوں مادیت پرستوں کو عبرت کا مقام دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اندر اپنے وطن سے پیار کا درس دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک کی امثال پیش کرتے ہیں اور ایثار تو صرف اپنوں سے کیا جاتا ہے نہ کہ قریش مکہ کے ساتھ۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

> ''اگر یہ بات ایثار کی ہے تو یہ ایثار کہیں سے تو شروع ہونا چاہیے...... بات پھر چین کی آ گئی: کتنے ہی چینی انجینئر اور سائنس دان جو امریکہ اور یورپ میں بیش قدر آمدنی کے مالک تھے۔ اس پر لات مار کر اپنے وطن آ گئے۔ وہاں جیسی دوسروں کی اوقات ویسی دوسروں کی۔ بینک بیلنس بے شک نہیں ہیں۔ نہ لمبی کاروں کی ریل پیل ہے، نہ اونچے محل حویلیاں ہیں لیکن مزے سے گزر کرتے ہیں۔ تبھی تو ان لوگوں نے ہائیڈروجن بم بنا لیا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ تانگے کا بم بنا

سکتے ہیں۔"[۱۱]

ثقافت وتمدن پر انشا جی نے بڑی کھل کر بات کی ہے اوراس کا تقابل اپنی تہذیب سے بھی کیا ہے۔آخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی بھی بے حیائی کا منبع آخر کواس کے مفکر اور ادبا وشعرا کے سر ہوتا ہے۔تہذیب کو بگاڑنے یا سنوارنے کا جتنا اہتمام یہ احباب کرتے ہیں سماج میں اس کی مثال نہیں ملتی۔مذہب اب اتنا آزاد خیال سمجھا جانے لگا ہے کہ اس نے ہر قول وفعل کی اجازت دے دی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ پھر اب مذہب تو نہ رہا، مذاق بن گیا ہے۔یہی کام پورے یورپ میں ہورہا ہے۔انشا جی کے اس سفر نامے کو اگر برطانوی تہذیب کا مطالعہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔فرماتے ہیں کہ یورپ کی تہذیب کو اگر سب سے زیادہ داغ دار کیا ہے تو نئے زمانے کے آزاد خیال اور مادیت پرست انسانوں نے خود کیا ہے۔یہ مصنف کی زیرک بینی ہے کہ وہ کسی ماحول کی جزئیات کو اس لحاظ سے بیان کرتے ہیں کہ ہر چیز واضح نظر آنے لگتی ہے۔چوں کہ آدمی جہاں رہتا ہے وہاں اسے ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ہر ہر چیز اس کی نظروں سے گزرتی جاتی ہے۔انشا جی نے بھی کمال کی جزئیات نگاری کی ہے۔مذہب سے کلچر اور ایڑی سے چوٹی تک کا ذکر اپنے سفر ناموں میں ڈال دیا ہے۔یہی مختصر چیزیں مصنف کی قابلیت کی عکاس ہیں۔

الغرض ابن انشا ایک منجھے ہوئے اردو ادب کے پجاری اور لکھاری ہیں۔تحریر وتقریر میں ایک معتدل آب وہوا کی آمیزش نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ان کے کلام میں اگر چٹکلے بازی کا بازار گرم ہے تو تصوف کے لامحدود تصور کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔اگرچہ اپنی بود وباش کی مہک ہے تو انگریزی بلکہ فرانسیسی اور روسی ثقافت کی مہک بھی اپنے گوناں گوں لوازمات کے ساتھ واضح نظر آتی ہے۔سفر نامے کو افسانوی رنگ میں ایسے رنگتے ہیں کہ یہ ہر دو رنگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور باہم متصادم بھی ہیں۔طرز نگارش صاف اور الہام سے پاک ہے۔ان کی قابل ستائش شخصیت مدغم ہونے کی بجائے انگلی پکڑے ہمیں مسرت کے بیکراں سمندر میں لے جاتی ہے۔بشاش اور معطر طبیعت شگفتگی کے ہزاروں گل کھلاتی ہمیں بادِ صرصر سے یخ بستہ نظاروں میں بے کیف کر دیتی ہے۔یہی اُن کی طرز تحریر کا خاصہ ہے کہ ہمیں دیر تک محویت کے عالم سے نہیں نکلنے دیتی۔

ایک معتدل تحریر کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر بہت سی خصوصیات لیے اپنا مافی الضمیر بھی بیان کرتی اور اپنی نشست وبرخاست سے بھی خالی نہیں ہوتی۔منظر نگاری تحریر وتقریر کو جاندار اور اس کی اہمیت کو درجہ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ابن انشا کے سفر نامے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے وہ سفر نہیں کر رہے بلکہ ہمیں کہانی سنا رہے ہیں۔الفاظ کی بندش اور ان کا موزوں استعمال ایسے کر رہے ہیں گویا تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔یہی نہیں بلکہ اس منظر کی پوری تفصیل اور جزئیات اتنی واضح اور مدلل انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ منظر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

"ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش کیا۔لیکن اس بندہ خدا نے تکرار کی چھ روپے دو، اور

لے کرٹلا۔اس پر اپنے قلی یاد آئے۔تین ٹرنک سر پر ہیں۔آپ کے بستہ کیس کو جس میں دو رضائیاں، کمبل، جوتے اور کرائے سے بچنے کے لیے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے۔ اپنے کاندھے میں حمائل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلا اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کہنی سے لٹکا ہوا۔بوجھ سے لہراتا ہوا چلتا ہے۔پل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں۔ اس کے بعد التجا کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔بعضے نیک دل دونی چونی دے دیتے ہیں۔بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔''۳۰؎

ابن انشاء کے سفر ناموں میں کمال کے مکالماتی لوازمات پائے جاتے ہیں۔ان مکالموں میں کبھی تو وہ خود کلامی کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی دوسرے کرداروں کے ساتھ گل ہائے عقیدت سے پیش ہوتے ہیں۔ان کے مکالموں میں ایک حقیقی لہر ہونے کی وجہ سے معتدل فضا قائم رہتی ہے۔یہ فضا جنوں پریوں کے ماحول کی عکاس نہیں بلکہ حقیقت اور مجاز میں ایک دیرینہ تعلق قائم رکھے ہوئے ہے۔لہجے میں متانت اور سنجیدگی جہاں ثقافت اور تاریخ کے پرتو پیش کرتی ہے وہاں ایک سبق آ؟ موز اور جھنجھوڑ دینے والی رمق بار بار آ کر ہمارے دروبان کھولتی ہے۔مندرجہ ذیل سطور دیکھیے:

''سید سبط حسن نے کہا'' میاں کیا کیا جائے۔اوپر کا آدھا دھڑ تو نہالیا ہوں۔ٹانگوں پر صابن کیسے لگاو؟ں۔اور پانی کا تریڑا ابھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔

ہم نے کہا۔یوگ ودیا سیکھی ہے آپ نے؟

بولے۔ہاں کچھ کچھ تو پڑھا ہے۔''

''تو شیر شک آسن کیجیے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے'' سید صاحب نے پوچھا۔

''سر کے بل کھڑے ہو جائے اور ٹانگیں اوپر کھڑی کر لیجیے۔پنڈت نہرو یہی کیا کرتے تھے۔تبھی تو ان کو ہر چیز الٹی نظر آتی تھی۔''(۳۱)

مکالماتی انداز میں ابن انشا کا خود کلامی انداز اتنا مدلل اور دلچسپ ہے کہ بندہ اش اش کر اٹھتا ہے اور داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ان کے ہر ایک مکالمے میں ایک بے کیف رونق اور مسرت ہے۔یہ مسرت زیر لب مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔سنا ہے کہ وہ بات کرتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں مگر اب حقیقت میں پڑھ کر دیکھ لیا ہے۔ ذرا دیکھیے۔

''ذکر ہم کل کا کر رہے تھے کہ شام کو پیٹ نے ہمیں مجبور کیا کہ کھول بٹوا۔کھلا ہمیں کھانا۔ہم نے

پچکارا کہ میاں ٹھہر۔ کوئی ہوٹل دیکھتے ہیں جس میں عام قسم کے لوگ بیٹھے ہوں۔ کیا کھائے گا؟ سینڈوچ کھلائیں؟ پنیر کے سینڈوچ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن پیٹ کی وہی رٹ۔ مرغ کی ایک ٹانگ۔''[۱۴]

حضرت انشا جی کا اسلوب نگارش اتنا اچھوتا اور دل کش ہے کہ تحریر اگر چہ از بر نہیں بھی ہو رہی مگر ڈرامائی سین اپنی تمام تر جولانیوں اور روشنیوں کے ہمراہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ انشا جی کی تحریر کی جو خوبیاں اور خصائل پر جو میری ذاتی رائے پر منتج ہیں وہ یہ ہیں کہ: ان کی تحریر سادگی کا پرتو ہونے کے ساتھ حقیقت کے ازلی پردوں سے پردہ چاک کرتی ہے۔ دوسری خوبی تاریخ کی ورق گردانی اور خشک وصرصری ہوا کو صبائے عنبر اور معطر بنائے دیتی ہے۔ اس کے علاوہ فہم وادراک میں پند ونصائح اس قدر راسخ ہوئے جاتے ہیں جیسے پتھر پر لکیر۔ کمال کی تقابل نگاری نہ صرف شخصی بلکہ گروہی سورج بیدار کرنے میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے جتنا کام کرتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مقام عبرت پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ شاید میرے الفاظ ان کی تحریر کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، تو فیصلہ اس پیراگراف کو پڑھ کر کیجیے:

''ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الیکٹرانکس ہے ہم پوچھنے کو تھے کہ الیکٹرانکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن از راہ مصلحت باز رہے۔ ایک اور ادارہ کتابیں تیار کر رہا ہے۔ جو پاکستان بھی آئیں گی، ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ معلوم ہوا دھاتوں پر کیمیاوی اثرات۔ ویلڈنگ، خراد اور آئل ٹیکنالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کرید کی کہ علم بدیع ومعانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعت توشیخ، مراعات النظیر، بے نقط وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم اے میں پڑھی تھیں۔ ان پر کام ہونا چاہیے، جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ ایک صاحب نے کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ سن ہجری یا سال عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن ہمیات۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان وبیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یا اب لوہے فولاد کیمیاوی کھاد تیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔''[۱۵]

انشا جی بڑے کھلے ذہن کے آدمی تھے، بے باکی تو ان کے ہاں وافر مقدار میں موجود رہتی ہے، ہونا بھی ایسا ہی چاہیے بھائی کیوں لگی لپٹی میں رکھیے۔ بات مبہم کیوں، شرم کیسی جب حقیقت حال واضح ہو۔ خیال رہے کہ حقیقت پسند آدمی بڑے ذہن اور کھلے دل کا مالک ہوتا ہے، یہی بات انشا جی کے ہاں بہتات کے ساتھ ملتی ہے۔ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر آدمی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر نشیب وفراز سے گزرتا ہے اور اُن لمحات کو من وعن بیان کر

دینا ہی اصلیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ بیتی آدمی کو ننگا کر دیتی ہے اور پھر قاقم وسرخاب کیا شیر کی کھال بھی بدن کی پوشیدگی سے قاصر رہتی ہے۔ انشا صاحب کا یہی خاصہ ان کی قد وقامت میں فراز کا کام کر جاتی ہے۔ ان کے ہاں بے تکلفی کے پٹاخے اور شگوفے مدغم ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے الفاظ کی حقیقت حال ملاحظہ کیجیے:

''یہ وقت کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا تھا اور اس خلفشار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم تنہا تھے۔ ممکن ہے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچتی لیکن ہم نے دیکھا کہ ہاتھ ہمارے خالی نہیں۔ ایک میں دہی تھی اور ایک میں دودھ کی بوتل۔ یہ چیزیں کمرے میں بیٹھ کر کنڈی لگا کر کھانے کی تھیں لیکن اس بے سروسامانی میں ان کا کیا کریں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پاسبان سے کہا بھیا! ایک دو گھنٹے ہمارے سامان پر نظر رکھو ہم کوئی کمرہ تلاش کر لیں۔ وہ کچھ نہ بولا کم از کم معترض نہ ہوا۔ گلی میں نکل کر ہم کو سب سے پہلے ہاتھ خالی کرنے کی فکر تھی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تو کچھ نہ کھایا جاتا۔ چلتے چلتے بھی کھانا ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا تو خلاف تہذیب ہوتا۔ دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں کچھ کاریں پارک تھیں۔ ہم نے ان کی اوٹ میں جا کر جلدی جلدی دہی کے مچے کاٹے اور پھر غٹ غٹ دودھ پی گئے۔''[۱۶]

دعویٰ جمال تو بہت سے کر لیتے ہیں مگر نقش ونگار اور باریک بینی خدا کی خاص دین ہے۔ کہتے ہیں کہ:

خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے

شاعر حضرات ایسے ہی قلابے نہیں ملاتے انھیں کچھ تو نظر آتا ہوگا۔ دہن تنگ، لبِ پتی، روشن جبیں، خندہ گل، رخسار رنگیں، سرو قامت، دندانِ براق، زلفیں ناگن وغیرہ وغیرہ۔ انشا جی بھی اسی برادری سے ہیں تو دوسرا کمال گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے، آٹے سے بال نکالتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ادب کا یہ پجاری ہاتھ میں چراغ لیے یورپ کی گلیوں میں اپنی ثقافت کے لوازمات ڈھونڈنے نکلا ہے۔ انشا جی کو اگرچہ یورپ و پیرس بہت پسند ہیں مگر مادیت پرستی پر کاری ضرب بھی لگاتے ہیں۔ غرض یہ کہ انھیں خدا نے ذہن رسا دیا ہوا ہے جو ہر بات پر پوشیدہ پرتو اتارتے جاتے ہیں اور ایک غیر معمولی کیفیت وارد ہوتی ہے۔ ذرا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

''بات ہم نے ایک ڈاکٹر سے کہی۔ بڑے ذہین آدمی ہیں۔ لندن سے باہر ایک شہر میں رہتے ہیں۔ ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ ہاں لاہور، لاہور ہے۔ یاد آتا ہے۔ اُردو کی کتابیں رسالے بھی دیکھے ہوئے مدت ہوئی۔ اب تم نے دکھائے تو وطن کی سوندھی خوشبو آئی لیکن ہم نے یہ مانا اس دلی میں پرکھائیں گے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے پاکستان میں ڈاکٹروں کے گریڈ بتانے شروع کیے۔ پاکستان میں اپنی ملازمت کے تجربے بتائے۔ ان کو ہم شافی جواب نہ دے

سکے۔ کیونکہ کچھ قصور ہمارا بھی نکلا لیکن ان ڈاکٹر صاحب کے نفع نقصان کو چھوڑ کر سوچا جائے تو کتنے لوگ ہمارے ملک کے قصبوں اور دیہات میں محض ڈاکٹر نہ ہونے اور طبی امداد نہ لینے سے مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کینیڈا جائیں تو فقیر کی چٹکی سے علاج کرنے والوں، طب چین و جاپان کے اشتہار دینے والوں اور مقناطیسی انگوٹھیوں اور کنگنوں والوں، عاملوں کاملوں، تعویذ گنڈے کرنے والوں اور فٹ پاتھ کے پروفیسروں کی کیوں نہ چاندی ہو۔'' ۱۷

کسی بھی ادیب کے فن پارے میں معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ مقابلہ اور موازنہ انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ نبی انبیاء نے بھی اپنی اپنی امتوں کے لیے بہت تکالیف برداشت کیں مگر ان کے مقاصد میں ذرا برابر بھی لغزش نہ آ?ئی۔ ملی و مذہبی درد ان کے ہاں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انشا جی کے ہاں بھی یہی ملی اور مذہبی درد بدرجہا اتم موجود ہے۔ وہ مسرت و شگفتگی کے لمحات میں قومی درد لیے ہوئے ہیں۔

چوں کہ پاکستانی باشندے ہیں اور تعلق ایک غریب ملک سے ہے لیکن جب اپنے ملک کے باشندوں خصوصاً وزراء امراء کا حال سنتے ہیں کہ ملک کا قریہ قریہ قرض اور غربت کی لکیر سے نیچے پینتیس فیصد عوام کا حشر نشر ہو رہا ہے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ایک طرف تو ملکی حالتِ زار پر روئے ہیں تو دوسری طرف خود کو پیش کر کے تضحیک کا منبع بھی بنتے ہیں۔ دیکھیے کیسے اپنی مسکینی اور کسمپرسی کا مذاق اڑاتے ہیں:

''سوئٹزر لینڈ کے بینک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے کاروبار کرتے ہیں۔ راز داری ان کا اصول ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاستدان اور ملک التجار ان بینکوں میں پیسے جمع کروا دیتے ہیں کہ کل کلاں تخت کا تختہ ہوا تو سوئٹزر لینڈ جا رہیں گے یا اس جمع جتھا کے بل پر کہیں اور بیٹھ کے عیش کریں گے اور بقیہ عمر یادِ خدا میں گزار دیں گے۔ ہم نے بھی پیسے جمع کراتے وقت خزانچی سے کہہ دیا کہ میاں اس رقم کا کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے۔ ملک کا قانون بہت سخت ہے کوئی شخص باہر روپیہ نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کہا۔ اطمینان رکھیے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے ملک کے اور بھی بہت سے رو?سا اور سیاست دان اور سابق وزیروں کے اکاؤنٹ ہمارے یہاں ہیں۔ بعضے تو سودے کر کے اپنا کمیشن سیدھا یہاں جمع کرا دیتے ہیں۔'' ۱۸

ادبی دنیا میں تخیل کی فراوانی سے نہ صرف مذکورہ چیز کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے بلکہ کئی صدیوں کی ثقافت و روایت اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اگر تخیل میں مٹھاس کے ساتھ کڑواہٹ بھی ہو یعنی تاریخ کی چبھن ہو تو کچھ اذہان رسا کو فہم و ادراک ملتا ہے اور کچھ محض ہنسی میں بغیر عبرت حاصل کیے صرف تحریر سمجھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ انشا جی کا تخیل جاوداں ہے۔ تاریخی اہمیت اگرچہ نہیں بھی ہے تو بھی مافی الضمیر سے نصیحت

ضرور کرتے ہیں۔ کسمپرسی، غربت اور مسکینی ان کے ذہنی تار کو بار بار آ کر چھوتی ہے۔ انشا جی اپنی تحریر میں اُسے بھی شامل کرتے ہیں جو بغیر سوچے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اور انھیں مقصدِ زندگی یاد نہیں اور وہ بھی ہیں جو دنیا میں آئے ہی صرف عیش وعشرت اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ دنیا مقامِ عبرت ہے مگر وحشی پن نے آدھی زیست اوائل عمری میں اور آدھی سیر دنیا میں گزار کر سدھارتے ہیں۔ مقام دنیا ملاحظہ ہو:

> ''پھر ہمیں صحراؤں کا خیال آیا۔ عرب کے صحرا، افریقہ کے صحرا کا، اپنے صحرا کا جہاں جہاں آدمی پانی کے قطرے اور گھاس کی پتی کو ترستا ہے اور وہ جگہیں دنیا میں واقع ہیں اور وہ لوگ اپنی صحراؤں میں زندگی کے کڑے کوس طے کرتے سوئٹزرلینڈ دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں اور دوسرے مویشی بھی موٹے مسٹنڈے نظر آئے۔ ہمارے مویشیوں کی طرح بھوکے ننگے نہیں۔ اب ہمارا خیال بھٹکتا ہوا گئو دان کی طرف گیا۔ پریم چند کی طرف گیا۔ پریم چند کی جنم بھوم کی طرف گیا۔ جہاں کال کے بادل ایک بار پھر منڈلا رہے ہیں۔''[۱۹]

رومانویت اور چٹکلے بازی حضرت انشا کی طبیعت کا خاصہ اور ان کی تحریر کی شان ہے۔ وہ ہر جگہ کبھی دھیمے لہجے میں اور کبھی طنزیہ لہجے میں بات کرتے ہیں اگر حقیقت نگاری کو لیجئے تو انھوں نے ہر جگہ یورپ اور اس کی اولاد بد نسل کی نہ صرف تضحیک کی ہے بلکہ گہری تنقید اور چوٹ بھی لگائی ہے۔'' آوارہ گرد کی ڈائری'' میں اُن کا رومانوی لہجہ کچھ ادب کے دائرے میں رہا ہے اور وہ باتوں باتوں میں رمز کی بات کرتے ہیں ایک پیراگراف حاضرِ خدمت ہے:

> ''اب اوپر کی جانب قریب آ رہی ہے کھٹ کھٹ۔ ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ ارے لڑکی تو اس ویرانے اور سناٹے میں کہاں جا رہی ہے۔ تجھے کسی کا ڈر نہیں۔ نیچے دریا پر کسی کی کشش تجھے لے جا رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ، خوشبو کا ایک جھونکا پاس سے گزر گیا...... اے اجنبی ان کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالنی چاہیے۔''[۲۰]

ابنِ انشا کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ہو یا نثر یا پھر سفرنامے اور روزنامہ کا اخبار کا کالم ہر ایک جملہ بڑے نپے تلے انداز میں ہے اور شاید ہی یہ خلا کبھی پُر ہو۔

حواشی:

1. Oxford Advance Learners, Oxford University Presss, 2010, P:568

۲۔ بلراج کومل، مضمون: شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی حد بندیاں، مشمولہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء) ص ۲۰۸

3. www.merriam-webster.com/dictionary/fiction

۴۔ افضل علوی، دیکھ لیا ایران، سخن چند، مشمولہ: اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، از خالد محمود،، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء) ص ۵۸

۵۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۴ء) ص ۵۷

۶۔ ابنِ انشا، آوارہ گرد کی ڈائری، (دہلی: فائن آفسیٹ پریس، ۲۰۰۰ء) ص ۲۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔ ۲۴۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۹۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۸۰

ماخذ:

۱۔ ابنِ انشا، آوارہ گرد کی ڈائری، دہلی: فائن آفسیٹ پریس، ۲۰۰۰ء

۲۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۴ء

۳۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء

۴۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء